شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے اہم فقہی نظریات

مولانا اختر امام عادل

فقہ کا رشتہ اس کے اصل سرچشموں سے

شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ اس پر زور دیا ہے کہ فقہ وفتاویٰ کو صرف چند کتابوں تک محدود کرنے کے بجائے اس کو اصل سرچشموں سے مربوط کیا جائے، اور عمومیت کے ساتھ یہ واضح کیا جائے کہ یہ علم قرآن وحدیث سے کس طرح اخذ کیا گیا؟ حجۃ اللہ البالغہ میں انھوں نے مستقل ایک مبحث قائم کیا ہے:

"مبحث استنباط الشرائع من حدیث النبی صلی اللہ علیہ وسلم" یعنی احادیث سے مسائلِ شرعیہ کے استنباط کا طریقہ کیا ہے؟ اس مبحث کے تحت ایک باب قائم کیا ہے: "باب کیفیۃ تلقی الامۃ الشرع من النبی صلی اللہ علیہ وسلم" یعنی امت نے اپنے نبیؐ سے علوم شرعیہ کی تحصیل کیسے کی؟ اس باب کے تحت شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے علوم شرعیہ کے حصول کے دو طریقے تھے:

۱۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ الفاظ وواقعات کے ظواہر کو محفوظ کیا گیا اور اس کو آئندہ نسلوں تک پہونچایا گیا، پھر اس کی کئی صورتیں ہیں: متواتر، مشہور، اور خبر واحد وغیرہ جس کے لیے محدثین نے باقاعدہ اصول مقرر کیے۔

۲۔ دوسرا طریقہ معنوی تحصیل یا اجتہاد واستنباط کا ہے، صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی عمل کرتے ہوئے یا کوئی قول ارشاد فرماتے ہوئے دیکھا تو دلائل وقرائن سے یہ استنباط کیا کہ یہ چیز واجب ہے، جائز ہے، یا مستحب ہے پھر یہ مسائل صحابہ سے تابعین تک اور ان سے تبع تابعین تک منتقل ہوئے۔ صحابہ کی اکثریت اس قوتِ

اجتہاد واستنباط کی حامل تھی، مگران میں چار صحابہ حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت ابن عباسؓ کو خاص امتیاز حاصل تھا، ان میں بھی حضرت عمرؓ سب سے ممتاز تھے، شاہ صاحب کے خیال میں امت کے تمام مجتہدین کے مذاہب فقہیہ، فقہِ فاروقی کے مقابلے میں وہی حیثیت رکھتے ہیں، جو ایک شرح کی متن کے مقابلے میں ہوتی ہے۔ (حضرت شاہ صاحب نے "فقہ فاروقی" کو باقاعدہ ایک رسالہ کی شکل میں مدوّن کیا ہے، یہ اس باب میں پہلا مبارک اقدام تھا جس کو شاہ صاحب نے دوسری اوّلیات کے ساتھ انجام دیا)[1]

حضرت عمرؓ کا طریقۂ کار یہ تھا کہ پیش آمدہ مسائل میں اجتماعی طور پر غور وخوض فرماتے تھے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت فاروق اعظمؓ کے فتاویٰ پوری مملکتِ اسلامیہ کے طول وعرض میں باتفاق رائے قبول کیے گئے، حضرت ابراہیم نخعیؒ فرماتے تھے کہ حضرت عمر فاروق کی وفات سے علم کے دس حصوں میں نو حصے رخصت ہو گئے۔ حضرت ابن مسعودؓ کا قول ہے کہ حضرت عمرؓ جو راہِ عمل انتخاب فرماتے وہ ہمیں سہل محسوس ہوتی تھی۔ دیگر صحابہ نے اپنے حالات اور مواقع کی بنا پر یہ طرز اختیار نہیں کیا، اس وجہ سے ان کے مسالک کی اشاعت محدود رہی۔

پھر تابعین نے یہ خدمت انجام دی، بالخصوص مدینہ میں فقہاء سبعہ، اور ان میں بھی حضرت سعید بن المسیبؒ، مکہ میں حضرت عطاء بن ابی رباح، کوفہ میں حضرت ابراہیم نخعیؒ، حضرت شریح اور حضرت شعبیؒ اور بصرہ میں حضرت حسن بصریؒ نے زیادہ نمایاں خدمات انجام دیں، اور اس طرح مسائلِ شرعیہ کا یہ علم طبقہ در طبقہ امت میں منتقل ہوتا رہا۔

دونوں طریقوں کا انضمام

مگر حصول کے یہ دونوں طریقے جداگانہ حیثیت میں ناکافی ہیں اور ان میں غلطی

---

[1] اس موضوع پر کوئی جامع منفرد کتاب اب تک تصنیف نہیں ہوئی تھی۔ حال میں (۱۴۰۱ھ م ۱۹۸۱) ڈاکٹر محمد روّاس قلعہ جی نے "موسوعۃ فقہ عمر بن الخطاب" کے نام سے ایک ضخیم مفصل کتاب مرتب کی جو مکتبۃ الفلاح کویت کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔ یہ کتاب بڑے سائز کے ۶۸۷ صفحات پر آئی ہے۔

کا بہت امکان ہے، اس لیے کہ طریقۂ اول میں کمزوری یہ ہے کہ روایت بالمعنی کی صورت میں الفاظ کی تبدیلی سے معنی بدل جانے کا اندیشہ ہے۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ کسی خاص واقعہ کے حکم کو راوی نے حکم کلی سمجھ لیا ہو، نیز یہ بھی امکان ہے کہ کسی مصلحت سے کی جانے والی تاکید کو راوی وجوب یا حرمت سمجھ بیٹھا ہو، حالانکہ فی الواقع معاملہ ایسا نہ ہو، اس لیے ضروری ہے کہ راوی فقیہ اور صاحبِ اجتہاد ہو تاکہ معاملہ کو صحیح طور پر پرکھ سکے۔

دوسرے طریقے میں نقص یہ ہے کہ اس میں صحابہ کے قیاسات اور اجتہادات کا بڑا حصہ شامل ہے جس میں غلطی کا بہرحال امکان ہے، اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی مسئلہ میں حدیث ہی نہیں ملی، یا ایسے طریق سے ملی کہ اس سے استدلال ممکن نہیں رہا اور اس بنیاد پر صحابی نے اجتہاد کو حکم کا مدار بنایا، اور اس کے بعد پھر کسی دوسرے صحابی سے صحیح اور واضح طور پر وہ روایت سامنے آگئی، مثلاً جنابت کے باب میں حضرت عمرؓ اور حضرت ابن مسعودؓ کا مسلک یہ نقل کیا جاتا ہے کہ تیمم کافی نہیں ہے، ان تک روایت صحیح طور پر نہیں پہونچی اور انھوں نے اجتہاد کو مدار بنایا، حالانکہ صحیح روایت موجود ہے۔

غرض دونوں طریقوں میں جداگانہ طور پر غلطی کے امکانات موجود ہیں۔ اس لیے فقہ واجتہاد کے معاملے میں محفوظ اور معتدل راستہ یہ ہے کہ دونوں طریقوں سے ایک ساتھ استفادہ کیا جائے اور دونوں کی روشنی میں اجتہاد واستنباط کیا جائے، تاکہ ایک کی کمزوری کی تلافی دوسرے سے ہوسکے، یہ ایک راہِ اعتدال ہے جس کا شاہ صاحب نے فقہ واجتہاد کے طلبہ اور علماء کو مشورہ دیا ہے[1]

قرونِ اولیٰ میں اہل الحدیث اور اہل الرائے

اس ضمن میں مناسب ہے کہ ان دو مکاتبِ فقہ کا تذکرہ کیا جائے، جو اسلام

---

[1] ولما کان الامر کذلک وجب علی الخائض فی الفقہ ان یکون متضلعاً من کلا العشرین ومتبحراً فی کلا المذہبین وکان احسن شعائر الملۃ ما اجمع علیہ جمہور الرواۃ وحملۃ العلم وتطابق فیہ الطریقتان جمیعاً (حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۳۲ اشرفی بکڈپو دیوبند ۱۳۷۳ھ طبع اول)

کے قرونِ اولیٰ میں اہل الحدیث اور اہل الرائے کے نام سے معروف تھے، شاہ صاحب نے "الانصاف" میں اس پر بہت مفصل گفتگو کی ہے۔ ان کے بیان کے مطابق یہ دونوں مکاتبِ فکر دراصل مذکورہ بالا دونوں طریقوں کی پیداوار ہیں، اہل الحدیث نے پہلے طریقے کو اختیار کیا، اور اہل الرائے نے دوسرے طریقے کو۔

یہ حضرت سعید بن المسیبؒ، ابراہیم نخعیؒ، زہریؒ اور ان کے بعد امام مالکؒ اور سفیان ثوریؒ کا دور ہے، یہ دونوں گروہ اسی دور میں وجود پذیر ہو گئے تھے۔

اہل حدیث کا طبقہ اجتہاد و استنباط اور قیاس و رائے کی بنیاد پر فتویٰ دینے سے حتی الوسع گریز کرتا تھا اور مجبوری کے بغیر وہ قیاس نہیں کرتا تھا۔ ان کی زیادہ تر توجہ احادیث و آثار پر ہوتی تھی۔ اس لیے یہ حضرات مستقبل کی امکانی صورتوں کو (جس کو فقہ تقدیری کہا جاتا ہے) بھی زیرِ بحث لانا پسند نہیں کرتے تھے۔

ان کے پیشِ نظر کئی ایسے آثار تھے جن میں امکانی صورتوں کا حکم بتانے سے گریز کی تلقین کی گئی ہے۔ مثلاً حضرت معاذ بن جبلؓ کا قول ہے۔

یاایھا الناس لاتعجلوا	حوادث کے آنے سے پہلے ان کے
بالبلاء قبل نزولہ لاینفك	بارے میں اظہارِ خیال نہ کرو اس لیے کہ
المسلمون ان یکون فیھم من	مسلمانوں میں ہر دور میں ایسے لوگ موجود
اذا سُئل سدّد[1]	رہیں گے جو ہر مشکل کا حل پیش کریں گے۔

حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، ابن عباسؓ اور ابن مسعودؓ سے بھی اسی طرح کی بات منقول ہے۔

بعض ایسے آثار بھی موجود تھے، جن میں رائے کی بنیاد پر فتویٰ دینے سے احتیاط کی تاکید کی گئی تھی۔ مثلاً حضرت ابن عمرؓ نے حضرت جابر بن زیدؒ سے فرمایا:

"اے جابرؒ تمہارا شمار فقہاء بصرہ میں ہوتا ہے، پس قرآن ناطق یا سنتِ معمولہ کے علاوہ کسی سے فتویٰ نہ دینا ورنہ تم ہلاک ہو جاؤ گے اور دوسرے کی ہلاکت کا بھی سامان کرو گے۔"[2]

---

[1] سنن دارمی، المقدمۃ، باب من ہاب الفتیا

[2] سنن دارمی، المقدمۃ، باب الفتیا وما فیہ من الشدۃ

ابوالنضر فرماتے ہیں کہ حضرت ابوسلمہ بصرہ تشریف لائے تو میں اور حسن بصری ملاقات کے لیے حاضر ہوئے حضرت ابوسلمہ نے حضرت حسن سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ آپ ہی حسن بصری ہیں؟ میں بصرہ میں سب سے زیادہ آپ ہی سے ملنے کا مشتاق تھا، مجھے یہ خبر ملی ہے کہ آپ اپنی رائے پر فتویٰ دیتے ہیں، اپنی رائے پر ہرگز فتویٰ نہ دیں[1]۔

ان آثار کی بنیاد پر اس طبقہ کی تمام تر توجہ احادیث و آثار کے جمع و تدوین کی طرف رہی، اس لیے کہ جس کے پاس احادیث و آثار کا جتنا بڑا ذخیرہ ہوتا وہ اتنا ہی زیادہ تعلیم اور فتویٰ کے لائق مانا جاتا تھا۔

ایک ایک حدیث کے سو سو سے زائد طرق تھے، اس طرح جرح و تعدیل اور اسماء الرجال کا وہ عظیم الشان علم وجود میں آیا، جس کی کوئی نظیر انسانی تاریخ میں نہیں ملتی، ایک ایک آدمی لاکھوں احادیث کا حافظ ہوتا تھا امام بخاریؒ کے بارے میں مشہور ہے کہ ان کی صحیح بخاری چھ لاکھ احادیث کا انتخاب ہے۔ امام ابوداؤدؒ کے بارے میں آتا ہے کہ انھوں نے اپنی کتاب پانچ لاکھ احادیث سے انتخاب کر کے تیار کی، امام احمدؒ نے اپنی مسند میں روایات کا اتنا بڑا ذخیرہ محفوظ کر دیا کہ کہا جاتا ہے کہ جو روایت اس میں نہ ملے، وہ بے اصل ہے۔ خود امام احمدؒ اپنی اس کتاب کو "میزان" کہتے تھے اور اسی بنیاد پر جب حضرت امام احمدؒ سے پوچھا گیا کہ کیا فتویٰ دینے کے لیے ایک لاکھ احادیث کافی ہیں، انھوں نے فرمایا نہیں، سائل اسی طرح اپنے سوالات میں احادیث کی تعداد بڑھاتا رہا۔ یہاں تک کہ جب تعداد پانچ لاکھ تک پہونچ گئی تو فرمایا کہ ہاں! اب امید ہے کہ فتویٰ دے سکتا ہے[2]۔

یہ فقہاء محدثین کا گروہ ہے جس نے حدیث اور فقہ الحدیث کی مثالی خدمت انجام دی ہے۔ شاہ ولی اللہ کے نزدیک اس جماعت میں سب سے مشہور اور سب سے عظیم المرتبت شخصیت امام احمد بن حنبلؒ کی ہے۔ وہ اس گروہ کے سرخیل ہیں اور سب سے زیادہ ان ہی نے اس طرز عمل کو فروغ دیا اور ان کا پورا مذہب فقہی اسی طرز عمل پر مبنی ہے۔ اسی لیے ان کے یہاں ایک ایک مسئلے میں کئی کئی

---

[1] دارمی حوالہ سابق
[2] غایۃ المنتہی

اقوال ملتے ہیں اور یہ ان کے نزدیک کوئی عیب کی بات نہیں تھی، شاہ صاحب اس مکتبِ فقہی سے بہت زیادہ متاثر ہیں، انھوں نے "حجۃ اللہ البالغہ" میں متعارض روایات پر عمل کے لیے جو فیصلہ کن گفتگو کی ہے وہاں اس کی صراحت کی ہے کہ اگر کسی چیز کے بارے میں دو طرح کی روایات منقول ہوں اور دونوں باہم متضاد نہ ہوں، اور من قبیل عادت ہو تو دونوں کو مباح قرار دیا جائے گا اور اگر من قبیل عبادت ہو تو دونوں کو مستحب یا دونوں کو واجب قرار دیا جائے گا۔ یعنی دونوں صورتوں میں سے کسی پر عمل کر لیا جائے تو مستحب یا واجب ادا ہو جائے گا۔[1]

شاہ صاحب نے اس مکتبِ فقہی کے حاملین میں امام احمدؒ کے علاوہ حضرت یزید بن ہارونؒ، یحییٰ بن سعید القطانؒ، امام اسحاقؒ اور بعد کے ادوار میں امام بخاریؒ، مسلمؒ ابوداؤدؒ، عبد بن حمیدؒ، دارمیؒ، ابن ماجہؒ، ابویعلیٰؒ، ترمذیؒ، نسائیؒ، دارقطنیؒ، حاکمؒ، بیہقیؒ خطیبؒ، دیلمیؒ، اور ابن عبدالبرؒ کے اسماء گرامی بھی شمار کیے ہیں۔ ان میں بھی امام بخاریؒ امام مسلمؒ، امام ابوداؤدؒ اور امام ترمذیؒ کو خصوصی اہمیت دی ہے۔ شاہ صاحب کے نزدیک ان ائمہ کی کتابیں اسی طرزِ فکر پر مرتب کی گئی ہیں اور وہ اس طرزِ فکر کے مجتہد کے لیے کافی ہیں۔[2]

(۲) اس کے بالمقابل دوسرا گروہ 'اہل الرائے' کے نام سے مشہور تھا، جو فقہ و فتاویٰ کے باب میں اجتہاد و استنباط کی بہ نسبت روایتِ حدیث کے معاملے میں زیادہ محتاط اور حساس تھا۔ ان کا خیال تھا کہ کسی مسئلے کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کرنے میں بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ احادیث میں اس پر تنبیہ کی گئی ہے، اس سے آسان اور محتاط صورت یہ ہے کہ حکم کی نسبت دوسرے فقہاء مجتہدین کی طرف کی جائے تاکہ اگر بیانِ حکم میں کوئی کمی بیشی ہو تو اس کی نسبت ذاتِ رسالت مآب کی طرف نہ ہو۔

شاہ صاحب کی عبارت ہے:-

[1] حکی صحابی انہ صلی اللہ علیہ وسلم فعل شیئاً وحکی اٰخر انہ فعل شیئاً اٰخر فلا تعارض ویکونان مباحین ان کانا من باب العادۃ دون العبادۃ ..... اویکونان جمیعاً مستحبین او واجبین یکفی احدھما کفایۃ الاٰخران کانا جمیعاً من باب القربۃ وقد نصّ حفاظ الصحابۃ علی مثلہ فی کثیر من السنن (حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۳۸ باب القضاء فی الاحادیث المختلفۃ)

[2] الانصاف ص ۹۶ تا ص ۵۶ دارالنفائس للطباعۃ، بیروت لبنان ۱۳۹۷ھ/۱۹۷۷ء

امام شعبیؒ کہتے تھے:

علی من دون النبی صلی اللہ علیہ وسلم احب الینا فان کان فیہ زیادۃ او نقصان کان علی من دون النبی صلی اللہ علیہ وسلم	یعنی غیر نبی کی طرف نسبت کرنا ہمیں زیادہ پسند ہے، اس لیے کہ اگر اس میں کوئی کمی یا بیشی ہوگی تو وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب نہ ہوگی۔

حضرت ابراہیم نخعیؒ فرماتے تھے:

اقول: قال عبد اللہ وقال علقمۃ احب الی	میں کسی حکم کے بارے میں یہ کہنا زیادہ پسند کرتا ہوں کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نیا حضرت علقمہ نے فرمایا ہے۔

اسی لیے ایسا بہت ہوتا تھا کہ کوئی حکم نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہوتا تھا، مگر بطور احتیاط بعض صحابہ اور تابعین اس کی نسبت حضورؐ کی طرف کرنے کے بجائے اپنے فتویٰ کے طور پر اس کو بیان فرماتے تھے جس سے بعض لوگ یہ خیال کرتے تھے کہ ان کا فتویٰ ہے، حالانکہ وہ قولِ رسول ہوتا تھا اور محض احتیاط کی بنا پر وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف انتساب نہیں کرتے تھے۔ اس فکر کی بنیاد دراصل اس روایت پر تھی جس میں حضورؐ نے ارشاد فرمایا ہے:

من کذب علی متعمداً فلیتبوأ مقعدہ من النار[1]	جو شخص میری طرف کوئی غلط بات منسوب کرے اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔

اس فکر کی جڑیں عہدِ صحابہ میں کافی حد تک مضبوط تھیں، بالخصوص عہدِ فاروقی تک نقل و روایت کے باب میں صحابہ حد درجہ محتاط تھے۔ حضرت عمرؓ فاروق نے انصار کی ایک جماعت کو کوفہ روانہ فرمائی تو ان کو نصیحت فرمائی کہ آپ حضرات کوفہ تشریف لے جا رہے ہیں، آپ وہاں ایسے لوگوں سے ملیں گے جن کے گھر اور سینے قرآن کی گونج سے آباد ہوں گے۔ وہ آپ کے پاس یہ کہتے ہوئے دوڑے آئیں گے کہ "رسول اللہؐ کے اصحاب تشریف لائے ہیں۔ رسول اللہؐ کے اصحاب تشریف لائے ہیں۔" وہ آپ لوگوں سے حضورؐ کی احادیث کے بارے میں پوچھیں گے ایسے نازک موقع پر آپ حضرات روایت کے باب میں زیادہ سے زیادہ محتاط رہیں[2]

---

[1] بخاری (مشکوٰۃ کتاب العلم)   [2] دارمی

حضرت ابن مسعودؓ کا حال یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے کوئی بات بتانے لگتے تو چہرے کا رنگ اڑ جاتا[۱]

ایک طرف نقل و روایت کے باب میں یہ احتیاط ان کو ملحوظ تھی، دوسری طرف ان کے پیش نظر وہ روایات اور آثار تھے جن میں کوئی مسئلہ منصوص نہ ملنے کی صورت میں انفرادی یا اجتماعی طور پر اجتہاد بالرائے کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔

حضرت معاذ بن جبلؓ جب یمن کے گورنر بنا کر بھیجے جا رہے تھے تو حضور کے دریافت کرنے پر جب آخر میں انھوں نے یہ فرمایا کہ "اجتہد برائی ولا الو (پیش آمدہ مسئلہ قرآن اور سنت میں نہ ملے گا تو اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور اس میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھوں گا) تو حضور نے ان کی تصویب فرمائی اور ان کی اس توفیقِ حق پر اللہ کا شکر ادا فرمایا[۲]

حضرت میمون بن مہرانؒ فرماتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خدمت میں کوئی مقدمہ پیش ہوتا تو پہلے 'کتاب اللہ' میں دیکھتے، اگر وہاں مسئلہ مل جاتا تو اس کے مطابق فیصلہ فرما دیتے اور اگر نہ ملتا تو سنتِ رسولؐ میں غور فرماتے، اگر وہاں بھی نہ ملتا تو صحابہ سے دریافت فرماتے کہ میرے سامنے یہ مسئلہ آیا ہے کیا آپ میں سے کسی کے علم میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی قول یا عمل ہے؟ ایسے مواقع پر کبھی بہت سے لوگ جمع ہو جاتے اور کئی لوگ بیان کرنے لگتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے معاملے میں یہ فیصلہ فرمایا ہے تو حضرت ابوبکرؓ خوش ہو جاتے اور فرماتے کہ اللہ کا شکر ہے جس نے ہمارے اندر علوم نبوت کے محافظین پیدا فرمائے اور اگر سنت سے بالکل رہنمائی نہ ملتی تو اربابِ علم کو جمع فرما کر مشورہ کرتے اور اجتماعی غور و فکر سے جو طے ہو جاتا اس کے مطابق فیصلہ فرما دیتے[۳]

قاضی شریحؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطابؓ نے ان کو لکھا کہ اگر تمہارے پاس کوئی ایسا مسئلہ آجائے جو کتاب اللہ اور سنت رسول میں منصوص نہ ہو اور نہ تم سے پہلے کے فقہاء کا کوئی قول اس کے بارے میں منقول ہو تو دو چیزوں میں سے

---

[۱] دارمی [۲] مشکوٰۃ شریف [۳] الانصاف ص۵۱

جس کو چاہو اختیار کرو، چاہو تو اپنی رائے سے اجتہاد کرو اور اسی طرح کرتے رہو اور چاہو تو رائے سے اجتناب کرو اور اسی احتیاط پر قائم رہو اور میں تمہارے لیے احتیاط ہی میں خیر سمجھتا ہوں[1]۔

حضرت ابن عباسؓ سے جب کوئی استفتا کیا جاتا اور وہ مسئلہ قرآن میں مل جاتا تو قرآن سے جواب دیتے ورنہ حدیث سے جواب دینے کی کوشش کرتے، اگر حدیث میں بھی نہ ملتا تو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے فیصلوں سے رہنمائی لیتے اور اگر ان سے بھی رہنمائی نہ ملتی تو اپنی رائے سے اجتہاد فرماتے[2]۔

چنانچہ اہل الرائے کے طبقہ نے اجتہاد و استنباط پر زور دیا، اس کے لیے باقاعدہ اصول و ضوابط مقرر کیے، تخریج و تنقیح کے قواعد متعین کیے اور روایت (یعنی علو سند) سے زیادہ فقاہت و درایت کو بنیاد بنایا، شاہ صاحب نے حضرت امام ابوحنیفہؒ کا یہ قول اسی پس منظر میں لیا ہے، انھوں نے حضرت امام اوزاعیؒ سے گفتگو کرتے ہوئے کہا تھا کہ:۔

ابراهيم افقه من سالم	ابراہیم نخعی سالم کے مقابلے میں زیادہ فقیہ
ولولا فضل الصحبة لقلت	ہیں اور اگر شرفِ صحبت حاصل نہ ہوتا تو میں
علمة افقه من ابن عمرؓ[3]	کہتا کہ حضرت ابن عمرؓ کے مقابلے میں حضرت علقمہؒ
	کا تفقہ زیادہ مضبوط ہے۔

اس کے بعد شاہ صاحب نے واقعات کی بڑی تلخ ترجمانی کی ہے اور ائمہ مجتہدین کے تلامذہ نے ان کے مجتہدات کو محفوظ اور مدوّن کرنے کے سلسلے میں جو مساعی جمیلہ انجام دیں ان کا تذکرہ کیا ہے ــــ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اس طبقہ کے نزدیک چونکہ اجتہاد و تخریج کو مرکزی اہمیت حاصل تھی اس لیے ان کے تلامذہ اور منتسبین نے اپنی جدّوجہد کو اسی رخ پر مرکوز کیا اور روایات و آثار سے زیادہ فقہی مجتہدات اور ائمہ کے اقوال کے حفظ و تدوین، ان سے قواعد و اصول کے استنباط

---

[1] الانصاف، حوالہ بالا [2] ایضاً [3] ایضاً

[4] حالانکہ امام ابوحنیفہ نے یہ بات تخریجی اصول کے طور پر کہی تھی جیسا کہ اس قول کے پس منظر سے واضح ہوتا ہے۔ اس کا منشا ہرگز یہ نہیں تھا کہ روایت کے مقابلے میں کسی کا اجتہاد تخریجی اہمیت رکھتا ہے۔ معاذ اللہ۔

واستخراج، مسائل کے درجات کی تعیین، طبقات فقہاء اور طبقاتِ کتب کی تحدید پر پورا زور صرف کیا۔ شاہ صاحب نے اس طبقے کی جو تصویر کشی کی ہے، اس میں شاہ صاحب کے عہد کے حالات کی بنا پر کچھ زیادہ تلخی آگئی ہے، اور اس پر بہت کچھ کلام کیا جاسکتا ہے، اسی طرح شاہ صاحب نے "اہل الرائے" کا جو مفہوم بیان کیا ہے یا جن لوگوں پر اس اصطلاح کا اطلاق کیا ہے وہ بھی محلِ نظر ہے ۔ مگر اس حد تک بہرحال درست ہے کہ اس دور میں علماء کا ایک (مختصر) طبقہ ایسا ضرور موجود تھا جو روایت سے زیادہ درایت اور اجتہاد کے اصول پر قائم تھا۔

راہِ اعتدال

ان دونوں طبقات کے تذکرے کے بعد شاہ صاحب نے جو راہِ عمل پیش کی ہے وہ انتہائی معتدل اور مبنی بر انصاف ہے۔ فرماتے ہیں:

"کلام فقہاء پر تخریج اور الفاظِ احادیث کا تتبع دین میں دونوں کی مستحکم اصل موجود ہے اور ہر زمانہ کے علماء محققین ان دونوں اصولوں پر عمل کرتے رہے ہیں۔ بعض ایسے ہیں جن کا تخریج میں قدم پیچھے ہے اور الفاظِ حدیث کے تتبع میں آگے اور بعض اس کے برعکس ہیں۔ ان میں سے کسی ایک اصول سے بھی مطلقاً صرفِ نظر مناسب نہیں، جیسا کہ فریقین کے عوام کا شیوہ ہے، اس بارے میں صراطِ مستقیم یہی ہے کہ دونوں کے درمیان تطبیق کی کوشش کی جائے اور ایک کی کمی دوسرے سے پوری کی جائے اس محتاط اور حکیمانہ نکتہ کی طرف امام حسن بصریؒ ہماری رہنمائی کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

سنتکم واللہ الذی لا الہ الا ھو ـــ بینہما بین الغالی والجافی	یعنی اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں کہ تمہارا راستہ حد سے بڑھنے والے اور حد تک نہ پہونچنے والے دونوں کے بیچ میں ہے۔

یعنی حق کا مرکز افراط و تفریط کے بیچ میں ہے ۔ جو اربابِ حدیث ہیں انھیں چاہیے کہ اپنے اختیار کردہ مسلک کو مجتہدینِ سلف کی آراء پر پیش کریں، اسی طرح جو اہل تخریج ہیں اور مجتہدین کے اصول پر مسائل کا استنباط کرتے ہیں انھیں بھی چاہیے کہ حتی الوسع صحیح اور صریح نصوص کو اپنے اصول اور رائے پر قربان نہ کریں، اور ایسا طریقہ نہ اختیار

کریں کہ فرمودۂ نبوی کی صریح مخالفت کا انھیں بار اٹھانا پڑے۔

کسی محدّث کے لیے یہ مناسب نہیں کہ وہ ان اصولِ حدیث کے اتباع میں بے جا تعمق اور توغّل سے کام لے، جنھیں پرانے محدثین نے وضع کیا ہے۔ کیونکہ بہرحال وہ بھی انسان ہی تھے اور شارع کی طرف سے ان کی صحت اور قطعیت پر کوئی سند نہیں پیش کی جاسکتی اور اس اصول پرستی کے تشدّد میں حدیث یا قیاسِ صحیح کو رد نہ کرے۔ مثلاً انقطاع یا ارسال کے ایک ذرا سے شک کی بنا پر کتنی ہی حدیثیں متروک اور ناقابلِ استناد ٹھہرادی جاتی ہیں۔ حالانکہ فی نفسہ وہ قولِ رسول ہوا کرتی ہیں۔ جیسا کہ ابن حزم نے اس طریقہ کی پیروی کرتے ہوئے تحریم معازف (باجوں کو حرام قرار دینے) والی حدیث کو ناقابلِ حجت قرار دے دیا۔ صرف اس وجہ سے کہ امام بخاری کی روایت میں انقطاع کا شبہ پایا جاتا ہے، حالانکہ حدیث فی نفسہٖ صحیح اور سلسلۂ سند متصل ہے، اور اس طرح کی روایت تعارض کے وقت قابلِ استدلال ہوتی ہے[1]

روایت اور درایت کے بارے میں معتدل نقطۂ نظر

شاہ صاحب نے اربابِ حدیث کی ایک اور اصولی کوتاہی کی نشاندہی کی ہے۔ فرماتے ہیں "ارباب حدیث کا ایک اصول یہ ہے کہ اگر ایک شخص کسی محدث کی روایتوں کو عموماً زیادہ صحت کے ساتھ محفوظ رکھتا ہے اور دوسرا ظاہری صحت کی حفاظت سے اعتناء نہیں کرتا، تو کلیتہً پہلے شخص کی ہر روایت (جو اس محدث سے کی گئی ہو) دوسرے راوی کی روایت پر مقدّم اور راجح مانی جاتی ہے، خواہ اس دوسرے راوی کے اندر ترجیح کے کتنے ہی اسباب و دواعی موجود ہوں۔

متنِ احادیث کے بارے میں صحیح مسلک یہی ہونا چاہیے کہ راوی جو کچھ بھی اپنی زبان سے کہے اسے کلامِ نبوی کی حیثیت سے مان لیا جائے۔ ہاں اگر کوئی اور قوی حدیث یا شرعی دلیل اس کے خلاف مل جائے تو مقدّم الذکر کو ترک کرکے اسے اختیار کرنا ضروری ہے۔

---

[1] الانصاف ص۶۲

ایسی ہی ذمہ داری اور احتیاط ان فقہاء پر بھی عائد ہوتی ہے جو ائمہ مجتہدین کے اصول اور فتاویٰ کو سامنے رکھ کر مسائل کا استخراج کرتے ہیں۔ ان کے لیے بھی یہ جائز نہیں کہ وہ کرید کرید کر ایسے اقوال نکالیں جن سے نہ تو خود ان ائمہ کے اصول اور ان کی تصریحات سے دُور کا تعلق ہو، نہ علماء لغت ان سے یہ معانی سمجھ سکیں اور نہ عرفِ عام میں ایسا طریقۂ سخن فہمی رائج ہو۔ بلکہ محض اپنے ذہن سے ایک علت متعین کر لی جائے یا ایک ادنیٰ مشابہت تلاش کر لی جائے اور اسے قول مجتہد ان کر صدہا مسائل میں اس خود آفریدہ علت یا مشابہت کو معیارِ حکم ٹھہرا لیا جائے، حالانکہ اگر وہ امام جس کے قول سے یہ تصریحات کی گئی ہیں، آج زندہ ہو کر آجائے اور یہ مسائل براہِ راست اس سے پوچھے جائیں تو وہ اس طرح کی تدقیقات و تخریجات کا انکار کر دے۔

تخریج کا یہ طریقہ نہایت غیر ذمہ دارانہ ہے۔ تخریج تو محض اس وجہ سے جائز ہے کہ وہ درحقیقت مجتہد کی تقلید اور پیروی ہے اور اس کا تحقق وہیں تک ممکن ہے جہاں تک امام کے اقوال عام اصولِ فہم و تدبر کے مطابق اجازت دیں۔

اس کے علاوہ ان فقہاء کو اس کا لحاظ بھی رکھنا چاہیے کہ وہ اپنے اصولوں کی پیروی کے جوش میں ان مستند احادیث یا آثار کو نہ رد کر دیں جنھیں محدثین میں مقبولیت حاصل ہو چکی ہے۔[1]

اصولی طور پر شاہ صاحب کی یہ فکر انتہائی معتدل اور دور رس نتائج کی حامل ہے۔ شاہ صاحب کی ان تنبیہات کا امت نے بڑا خوشگوار اثر قبول کیا، بیداری پیدا ہوئی، اور امت کے مختلف طبقات نے ان کے زیرِ اثر اپنے فکر و عمل میں اعتدال لانے کی کوشش کی۔

شاہ صاحب کی تنبیہات درحقیقت علامہ ابوسلیمان الخطابیؒ کی کتاب "معالم السنن" سے مستفاد ہیں۔ جس کا حضرت شاہ صاحب نے الانصاف میں حوالہ دیا ہے اور ایک طویل اقتباس بھی نقل کیا ہے۔[2]

البتہ خطابی کے کلام میں وہ زورِ استدلال اور عقلی انداز نہیں ہے جو شاہ صاحب

---

[1] الانصاف ص ۵۷ تا ۶۳ [2] ایضاً ص ۶۴ تا ۶۷

کے یہاں ہے اسی طرح خطابی کے کلام میں لب ولہجہ کی ناگواریت کچھ زیادہ محسوس ہوتی ہے، جبکہ حضرت شاہ صاحب کے یہاں کافی حدتک توازن موجود ہے۔

تنقیدی مطالعہ کی ضرورت

"کافی حدتک" کی قید اس بنا پر ہے کہ ادوارِ فقہی کی تصویر کشی میں شاہ صاحب کے یہاں بھی مکمل توازن قائم نہیں رہ سکا ہے۔ اسی طرح بعض اصولی باتوں کی شاہ صاحب نے جو مثالیں دی ہیں وہ پوری طرح منطبق نہیں ہیں۔ مثلاً اسی آخری ٹکڑے میں اس اصولی گفتگو کے ذیل میں کہ محض اصولِ مستخرجہ کی بنا پر مقبول اور صحیح روایات کو رد نہیں کرنا چاہیے (اس اصول سے فقہاء حنفیہ کو بھی اختلاف نہیں ہے، بلکہ ان کے اصول مستخرجہ کی بنیاد میں اس کا لحاظ کیا جاتا ہے) اس کی ایک مثال شاہ صاحب نے حدیثِ "مصراۃ" پیش کی ہے۔ اس پر کافی گفتگو کی جاسکتی ہے کہ فقہاء حنفیہ نے حدیثِ مصراۃ کو محض اپنے اصولوں کی بنیاد پر نہیں بلکہ بعض قرآنی نصوص اور اسلام کے عام اصولِ مکافات کی بنا پر چھوڑا ہے[1]

اس طرح کا عدمِ توازن شاہ صاحب کے یہاں فقہ واجتہاد کے مباحث میں کئی جگہ کھٹکتا ہے اور اصولی طور پر نتیجۂ بحث سے اتفاق کے باوجود تمثیلی یا تصویری اعتبار سے شاہ صاحب سے اتفاق بہت مشکل نظر آتا ہے۔ ہوسکتا ہے یہ میرے فکر ونظر اور علم ومطالعہ کی نارسائی ہو لیکن اربابِ نظر کو اس جانب توجہ دلاتے ہوئے اس قدر کہنے کی جسارت ضرور کروں گا کہ فقہ واجتہاد کے موضوع پر شاہ صاحب کے کلام کا تنقیدی مطالعہ بھی ضرور ہونا چاہیے۔

اجتہاد۔ مفہوم اور مراتب

شاہ صاحب کے یہاں ایک اہم ترین بحث اجتہاد کے مفہوم، مراتب اور دائرۂ کار کی بھی ہے۔ شاہ صاحب نے 'الانصاف' اور 'عقد الجید' میں اجتہاد کے

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھئے، العرف الشذی اور اعلاء السنن

مفہوم، مراتب اور اس کے طریقۂ حصول پر کافی مفصّل بحث کی ہے۔ الانصاف میں فرماتے ہیں:۔

"اجتہاد کا مفہوم یہ ہے کہ انسان تتبّع نصوص و آثار اور اصول و قواعد کی تخریج و استحضار کے ذریعہ ایسی معرفت اور صلاحیت حاصل کرلے کہ وہ زیادہ تر مسائل و واقعات کا جواب دے سکے اور اس کے جوابات کا بیشتر حصہ واضح اور صریح و صحیح ہو۔[1]

عقد الجید میں مجتہدِ مطلق کی تعریف یہ کی گئی ہے:

"مجتہد وہ شخص ہے جو قرآن، حدیث، مذاہبِ سلف، لغت، قیاس ان پانچ چیزوں میں کافی دستگاہ رکھتا ہو یعنی مسائلِ شرعیہ کے متعلق جس قدر قرآن میں آیتیں ہیں، جو حدیثیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں جس قدر علم لغت درکار ہے، سلف کے جو اقوال ہیں، قیاس کے جو طرق ہیں تقریباً سب کا علم ہو اگر ان میں کسی ایک میں بھی کمی ہے تو وہ مجتہد نہیں ہے اور اس کو تقلید کرنی چاہیے۔"[2]

مجتہد کا دائرۂ عمل

مجتہد کے فرائض کیا ہے؟ اور اس کا دائرۂ عمل کیا ہے؟ شاہ صاحب نے اس پر مصفّٰی شرح مؤطّا میں کافی تفصیلی اور عمدہ کلام کیا ہے اس کے بعض اہم حصے پیش خدمت ہیں:

" مجتہد کے فرائض درج ذیل ہیں۔

(۱) مشتبہ الفاظ کی وضاحت کرنا، اس ضمن میں چار چیزیں آتی ہیں۔

تقسیم[1]، مثال[2]، اصل مطلوبہ[3] معنی کی تعیین، اور دلائلِ شرعیہ کی جستجو،

۱۔ تقسیم کا مطلب یہ ہے کہ شئ مطلوب کا وہ عام حصہ لیا جائے، جس کے عموم میں خود یہ بھی شامل ہو اور اس کے دیگر تمام افراد، پھر اس ضمن میں داخل تمام اشیاء کا موازنہ کیا جائے، اور شئ مطلوب اور اس کے دیگر نظائر کے درمیان وجوہ فرق کو محسوس کیا جائے اور ان کے درمیان ایسے حدود و قیود مقرر کیے جائیں کہ مفہوم عام

---

[1] الانصاف ص ۱۰۲

[2] عقد الجید مبحث فی حقیقۃ الاجتہاد ص ۷ مطبوعہ دار الاخلاص ترکی

اصطلاح منطق میں بمنزلۂ جنس ہو جائے اور دیگر قیودات بمنزلۂ فصل۔ مثلاً "سفر سے یا وطن سے خروج" عام معنی کے لحاظ سے اس کا اطلاق تفریح کے لیے سیرِ گلشن پر بھی ہوتا ہے اور بلا مقصد اِدھر اُدھر مارے مارے پھرنے پر بھی اور بامقصد طور پر کسی خاص منزل کی طرف سفر پر بھی، لیکن غور کیا جائے تو ان کے درمیان کافی فرق ہے۔ سفر شرعی اور سفر تفریح کے درمیان فرق یہ ہے کہ سفر تفریح میں منزل قریب اور واپسی آسان ہوتی ہے جب کہ سفر شرعی میں یہ بات نہیں ہوتی، اسی طرح سفر شرعی اور بے مقصد مارے مارے پھرنے میں بھی فرق ظاہر ہے کہ ایک بامقصد ہے اور دوسرا بے مقصد۔

۲۔ مثال کا مطلب ہے حتی الوسع ان تمام جزئیات کا استحضار جن پر اس کلمہ کا لغوی طور پر اطلاق ممکن ہو۔ مثلاً "سفر" کا اطلاق کہاں سے کہاں تک پر ہو سکتا ہے، جدہ سے مکہ تک، عسفان سے مکہ تک، مکہ سے مدینہ تک، حیدر آباد سے پٹنہ تک وغیرہ

۳۔ اصل مطلوبہ معنی کی تعیین کا مطلب یہ ہے کہ شئی کے تمام وجودی اور عقلی لوازم پر ذہنی وجدان سے غور کیا جائے اور پھر اس کے تمام اطلاقات کو ذہن میں رکھتے ہوئے، مقررہ معیار پر پرکھا جائے، کہ اصل مطلوبہ حصہ کیا ہے؟ مثلاً "خف" پاؤں کا لباس ہے، مگر یہ کپڑے کا نہیں بلکہ چمڑے کا لباس ہے۔ یہ ٹخنے تک بھی ہو سکتا ہے، اور ٹخنے سے اوپر گھٹنے تک بھی، مگر ٹخنے سے اوپر ہو یا نہ ہو اصل حکم شرعی پر اس سے کوئی اثر نہیں پڑتا، اس لیے کہ مطلوب صرف اس قدر ہے کہ محل فرض پر خف ہے یا نہیں۔ قطع نظر کہ اس سے زیادہ ہے یا نہیں؟

۴۔ دلائل شرعیہ کے تتبع کا مفہوم یہ ہے کہ متعلقہ تمام دلائل پر اس طرح غور کیا جائے کہ کن قیودات کی موجودگی میں حکم شرعی پایا جاتا ہے اور کن کی موجودگی میں نہیں، اس طرح تمام دلائل (نصوص و آثار) سامنے رکھ کر مجتہد کوئی ایسا جامع مانع اصول یا تعریف دریافت کر سکتا ہے جس کے مطابق حکم شرعی کا اطلاق کیا جا سکے، مثلاً حج تمتع کی تعریف کیا ہے؟ اور اس کا اطلاق کس حج پر ہوگا؟ اس سلسلے میں اگر متعلقہ دلائل شرعیہ کو جمع کیا جائے تو حج تمتع کی حقیقت سمجھی جا سکتی ہے۔ ایک آیت کریمہ ہے:

فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى ... پس جو عمرہ کو حج کے ساتھ کرنے کا فائدہ

الْحَجِّ (بقرہ:۱۹۶) اٹھائے

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حج تمتع نام ہے حج اور عمرہ کو اشہرِ حج میں جمع کرنے کا۔ اور آیتِ کریمہ کا دوسرا ٹکڑا ہے:

ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ یہ حکم اس شخص کے لیے ہے جو مسجد حرام
حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (بقرہ:۱۹۶) کا حاضر باشندہ نہ ہو۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ حکم صرف آفاقی کے لیے ہے، مکی کے لیے نہیں۔

اس طرح دونوں آیتوں میں غور کرنے سے ثابت ہوا کہ حج تمتع یہ ہے کہ کوئی آفاقی شخص اشہرِ حج میں حج اور عمرہ کو جمع کرے۔

(۲) ہر شے کے ارکان، شرائط اور آداب کی تعیین کرنا۔ اس کی بنیاد بھی نصوص اور شرعی اشارات کے تتبع اور ان مقامات کے استقرار پر ہے جہاں شریعت نے اس کا ذکر کیا ہو، اسی طرح ضروری ہے کہ متعلقہ مسئلہ کے تمام اجزاء اور شرائط کی تفتیش کی جائے، اسی طرح ذہن میں حاصل شدہ مفہوم میں سے کون سا حصہ شرعی ہے اور کون سا عادی؟ اس کو دلائل اور قرائن سے ثابت کیا جائے۔

(۳) صیغۂ امر سے وجوب مراد ہے یا استحباب؟ اور صیغۂ نہی سے حرمت مراد ہے یا کراہیت؟ اس کی تعیین۔

(۴) دلائل کے ساتھ علتِ حکم کی معرفت، اسی طرح علت کے مطابق حکم کے اطلاق و تقیید کی معرفت بھی ضروری ہے۔

احکام میں علت کی بڑی اہمیت ہے۔ اس لیے کہ قانونِ اسلامی ایک آفاقی اور دائمی قانون ہے اور یہ ممکن نہیں تھا کہ قیامت تک آنے والے مسائل و جزئیات کی تصریح قرآن و حدیث کے صفحات میں کر دی جاتی، اسی لیے شریعت نے احکام کے ساتھ ایک یا چند اوصاف و علل وابستہ کر دیئے ہیں جن کی بنیاد پر اس جیسے دوسرے مسائل و جزئیات کا حکم بھی معلوم کیا جا سکتا ہے، مجتہد کی ذمہ داری ہے کہ وہ نصوص میں تدبر و تفکر کر کے ان علتوں کا استخراج کرے جو ان احکام کے پسِ پردہ موجود ہیں۔

(۵) احترازی اور اتفاقی قیود کی معرفت

(۶) ایسے جامع مانع قاعدہ کا استخراج جس میں حکم کے اطلاق و تقیید یا قیدِ احترازی

واتفاق کا لحاظ رکھا گیا ہو۔

(۷) متعلقہ احکام کے سلسلے میں تخریج شدہ اقوال اور ایک باب سے دوسرے باب کی طرف اس کی منتقلی۔

(۸) نئے مسائل کی تفریع عموم احکام واصول کی روشنی میں۔

(۹) دلائل میں اختلاف کی صورت میں جمع وتطبیق یا نسخ وترجیح۔

جو عالم مذکورہ امور پر نگاہ رکھے اور ان پر مکمل مہارت حاصل کرلے وہ مجتہدِ مطلق کا مقام حاصل کرسکتا ہے۔ وہ فتاویٰ جاری کرسکتا ہے اور اس پر کسی دوسرے عالم کی تقلید بھی لازم نہیں رہے گی۔ بلکہ اگر اللہ توفیق دے اور اس کے لیے اسباب و وسائل فراہم ہوں تو دوسروں کے لیے جائز ہوگا کہ وہ ایسے ماہر شخص کی تقلید کریں اور دینی مسائل میں اس پر اعتماد کریں۔

شاہ صاحب نے اس امر کی تصریح کی ہے کہ انھوں نے یہ فن اوّلاً حضرت امام شافعیؒ کی کتاب سے حاصل کیا۔ پھر بعد میں علامہ بغویؒ کی کتاب "شرح السنۃ" سے بھی انھوں نے بھرپور استفادہ کیا۔ انھوں نے یہ فن اگرچہ کسی استاذ سے بالمشافہ نہیں پڑھا، صرف کتابوں کے مطالعہ سے ان کو یہ حاصل ہوا، مگر خود کتابوں سے تحصیلِ فن کا طریقہ تو بہرحال انھوں نے اپنے اساتذہ اور ائمہ فن سے سیکھا اور پھر اسی کی روشنی میں انھوں نے کتابوں کو اپنا رہنما بنایا۔[1]

حضرت شاہ صاحب کا یہ علمی اور بصیرت افروز مقدمہ ان کی فنی بصیرت اور اجتہادی صلاحیت کا پتہ دیتا ہے۔

طبقاتِ فقہاء کی مشہور تقسیم اور شاہ صاحب کا نقطۂ نظر

فقہاء حنفیہ کے یہاں طبقاتِ فقہاء کی بحث بھی کافی پیچیدہ ہوگئی تھی۔ ابن کمال پاشا رومی (متوفی ۹۴۰ھ) نے اپنے بعض رسائل میں فقہاء کے سات طبقات شمار کرائے تھے۔ اگرچہ کہ حنفی مصنفین عام طور پر اس کا اعادہ کر رہے تھے مگر پھر بھی بعض حلقوں

---

[1] مقدمہ مصفی شرح الموطا علی المسوی ص ۴۶ تا ص ۵۳ مطبوعہ بیروت ۱۴۰۳ھ/۱۹۸۳ء

میں اس تعلق سے کچھ بے یقینی کی کیفیت پائی جاتی تھی۔ بالخصوص ان طبقات کے تحت جن فقہاء کے اسماء گرامی شمار کرائے جاتے تھے، وہ بہر حال قابلِ اعتراض تھا۔ علامہ ہارون بن بہاء الدین بن شہاب الدین المرجانی الحنفی نے اس پر کھل کر تنقید کی ہے۔ ابن کمال پاشا کی تقسیم میں حضرت امام ابو یوسفؒ اور حضرت امام محمدؒ کو طبقۂ ثانیہ یعنی "مجتہد فی المذہب" میں رکھا گیا ہے، جس طبقہ کے فقہاء اصولوں کے استنباط کی قدرت نہیں رکھتے، اصولوں میں وہ اپنے امام کے مقلد ہوتے ہیں، البتہ فروع میں امام کے اصولوں کی روشنی میں اجتہاد کر سکتے ہیں، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ اصولوں میں بھی اپنے امام سے اختلاف کرتے ہیں اور اصول کی کئی کتابوں میں صاحبین کے اصولی اختلاف کا تذکرہ موجود ہے، قاضی ابو زید دبوسیؒ نے "تاسیس النظر" میں مستقل ایک باب ان حضرات کے اصولی اختلاف پر قائم کیا ہے، اور اس کا احساس دوسرے مکتبِ فقہ کے علماء و فقہاء کو بھی ہے۔

علامہ نوویؒ نے تہذیب الاسماء میں ابو المعالی الجوینیؒ کے حوالے سے امام مزنیؒ کے مختارات کا موازنہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ امام مزنی کے مختارات و ترجیحات مذہب شافعی کا حصہ ہیں، ان کی کوئی جداگانہ حیثیت نہیں ہے اس لیے کہ امام مزنی حنفیہ میں امام ابو یوسف اور امام محمد کے درجے کے مجتہد فقیہ نہیں ہیں، یہ حضرات تو اصولوں میں بھی اپنے امام سے اختلاف کرتے ہیں جب کہ امام مزنی اختلاف نہیں کرتے۔

علاوہ ازیں حضرت امام احمد بن حنبلؒ کے بارے میں کئی لوگوں کو اختلاف ہے کہ ان کا شمار فقہاء میں ہونا چاہیے یا حفاظ حدیث میں؟ امام ابو جعفر طبریؒ نے ان کا شمار فقہاء میں نہیں کیا ہے بلکہ کہا ہے کہ یہ حفاظ حدیث میں ہیں، اس کے باوجود یہ مجتہد مطلق ہیں، اس لحاظ سے حضرت امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ مجتہد مطلق کیوں نہیں قرار پا سکتے ہیں[1] اس کے علاوہ اور بھی کئی اعتراضات کیے گئے ہیں[2]

ظاہر ہے کہ شاہ صاحب کی حساس فکر نے اس کو کیوں کر محسوس کیا ہوگا؟ شاہ صاحب

---

[1] النافع الکبیر مقدمہ الجامع الصغیر مولانا عبدالحیٔ لکھنوی ص ۱۱ ــ ۱۲ ادارۃ القرآن، کراچی ۱۴۱۱ھ/ ۱۹۹۰ء

[2] تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے راقم سطور کا مقالہ "طبقاتِ فقہاء کی حقیقت" شائع شدہ ترجمان دارالعلوم، دہلی

نے اپنے کسی اعتراض یا احساس کا ذکر کیے بغیر "الانصاف" میں طبقات فقہاء کی تقسیم کو ایک دوسرا رخ دے دیا ہے اور اس طرح عملاً انھوں نے ابن کمال پاشا کی تقسیم کے حق میں اپنی بے اطمینانی کا اظہار کر دیا ہے انھوں نے جو رخ دیا ہے وہ انتہائی مثبت، معقول اور مبنی بر حقیقت ہے۔

سابقہ تقسیم میں مجتہد کی صرف دو قسمیں تھیں، مجتہد مطلق مستقل، اور مجتہد فی المذہب (مجتہد فی المسائل اصلاً مجتہد نہیں ہوتا) شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ مجتہد کی تین قسمیں ہیں مجتہد مطلق مستقل، مجتہد مطلق منتسب، مجتہد فی المذہب۔

(۱) مجتہد مطلق مستقل کے لیے ضروری ہے کہ:

(الف) وہ فقیہ النفس، سلیم الفکر اور زبردست قوتِ استنباط کا مالک ہو، قرآن، حدیث، مذاہبِ سلف، لغت اور قیاس ان پانچوں چیزوں میں کافی دستگاہ رکھتا ہو، نصوص اور آثار پر ایسی گہری نگاہ ہو کہ وہ مختلف دلائل میں جمع و تطبیق و ترجیح کا فیصلہ کر سکتا ہو۔

(ب) مسائل کے استنباط کے لیے خود اصول و قواعد مقرر کرتا ہو اور اس میں وہ کسی کا مقلد نہ ہو۔

(ج) نئے پیش آمدہ مسائل و جزئیات کی تفریع کرتا ہو۔

تعریف کے یہ تین ٹکڑے دوسرے فقہاء کے یہاں بھی ملتے ہیں۔ شاہ صاحب نے اس میں ایک چوتھے ٹکڑے کا اضافہ کیا ہے اور وہ یہ کہ:

(د) اسے آسمانی مقبولیت بھی حاصل ہو اور علماء، فقہاء، مفسرین، محدثین اور اصولیین کی مختلف جماعتوں نے اس کے طرزِ اجتہاد اور مجتہدات کو قبول کیا ہو اور یہ سلسلہ صدیوں جاری رہا ہو اور اس کے ماننے والے بڑی تعداد میں ہر دور میں موجود رہے ہوں، مثلاً ائمہ اربعہ (امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ)

(۲) مجتہد مطلق منتسب: وہ ہے جو ان تمام شرائطِ اجتہاد کا حامل ہو جن کا ذکر مجتہد مطلق مستقل میں کیا گیا ہے۔ اسی لیے وہ اصولوں میں بھی امام سے اختلاف رکھتا ہو، یہ بھی مجتہد مطلق ہی ہوتا ہے، مگر منہجِ فکر اور طریقِ استنباط اس نے اپنے امام سے حاصل کیا ہو، اور اس کا فکری اور اجتہادی زاویہ اپنے امام کے طرزِ اجتہاد سے ماخوذ ہو اور اسی بنا پر وہ

اپنے امام کی طرف منسوب ہو۔

(۳) مجتہد فی المذہب: وہ ہے جو تخریج و استنباط کی مکمل صلاحیت رکھتا ہو، اپنے مذہب کا بصیرت منداور محقق عالم ہو، مذہب کے اصولوں اور تفصیلی دلائل سے پوری طرح باخبر ہو، وہ جزئیات اور نئے پیش آمدہ مسائل میں اپنے مذہب کے اصولوں کی روشنی میں استنباط کرسکتا ہو۔ مگر اصول میں وہ اپنے امام کا پابند ہو، اصولی طور پر وہ اپنے امام سے اختلاف نہ کرسکتا ہو۔

شاہ صاحب نے ان تینوں درجات کو طب اور شاعری کی مثالوں سے بھی سمجھانے کی کوشش کی ہے اور کہا ہے کہ یہ تقسیم، علم تفسیر، تصوف اور دیگر علوم میں بھی جاری ہوگی۔[1]

اگرچہ شاہ صاحب نے کوئی نئی فکر پیش نہیں کی ہے۔ بلکہ ان کی جڑیں ان سے قبل کے مصنفین و محققین شوافع کے یہاں موجود ہیں۔ حافظ ابن حجر مکیؒ نے اپنے رسالہ "سنن المغارۃ علی من اظہر معرۃ لقولہ فی الحناو عوارہ" میں اس تقسیم کا ذکر کیا ہے۔ اسی طرح میزان میں علامہ عبدالوہاب شعرانیؒ نے بھی علامہ جلال الدین سیوطیؒ کے حوالہ سے اس کا تذکرہ کیا ہے۔[2]

لیکن مجدد کا اصل کام یہ نہیں کہ وہ ہر باب میں نئی چیز پیش کرے، بلکہ اس کا اصل کام یہ ہے کہ وہ کسی چیز کو بروقت اور نئے طور پر پیش کرے اور یہ کارنامہ شاہ صاحب نے بخوبی انجام دیا ہے۔

سلسلۂ اجتہاد جاری ہے یا نہیں؟

یہاں ایک اہم ترین مسئلہ یہ ہے کہ یہ سلسلۂ اجتہاد جاری ہے یا موقوف ہوچکا ہے؟ یہ مسئلہ بھی گذشتہ ادوار میں کافی موضوعِ بحث رہ چکا ہے، میزان میں امام عبدالوہاب شعرانی نے جلال الدین سیوطی سے نقل کیا ہے کہ اجتہاد کی دو قسمیں ہیں، اجتہاد مطلق غیر منتسب، مثلاً ائمہ اربعہ کا اجتہاد، اور اجتہاد مطلق منتسب۔ مثلاً ان ائمہ کے تلامذہ اور اصحاب کا اجتہاد۔

---

[1] الانصاف فی بیان اسباب الاختلاف ص ۸۰-۸۳ [2] النافع الکبیر لمن یطالع الجامع الصغیر ص ۱۲

اجتہادِ مطلق غیر منتسب کا دعویٰ ائمہ اربعہ کے بعد کسی نے نہیں کیا، صرف ایک امام محمد بن جریر طبریؒ نے اس کا دعویٰ کیا تھا، مگر کسی نے اس کو تسلیم نہیں کیا۔ رہا یہ کہ اب عملاً کسی کے لیے ائمہ اربعہ میں سے کسی کے مقام تک پہونچنا ممکن ہے یا نہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ پہونچنا ممکن ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے اور قرآن و حدیث میں کوئی ایسی دلیل موجود نہیں جس سے عدمِ امکان یا عدمِ وقوع ثابت ہوتا ہو، لیکن واقعاتی طور پر ائمہ اربعہ کے بعد کوئی اس مقام تک نہیں پہونچ سکا۔ امام طبریؒ نے دعویٰ بھی کیا تو لوگوں نے اسے قبول نہیں کیا، اس لیے کہ اب کوئی منہج اجتہاد یا طرزِ استنباط باقی نہیں جو سابقہ ائمہ نے استعمال نہ کیا ہو۔ اس لیے بعد میں آنے والا ہر امام انہی مناہجِ استنباط میں سے کسی ایک منہج کو اختیار کرنے پر مجبور ہے۔ جو ائمہ اربعہ نے اختیار کیا تھا اور یہ اجتہاد منتسب ہے جس کا دروازہ بند نہیں ہے البتہ کوئی نیا منہج استنباط پیدا کرنا اب عملاً ناممکن ہے۔[1]

علامہ بحر العلوم لکھنویؒ نے "شرح تحریر الاصول" میں اور "شرح مسلم الثبوت" میں اس خیال کی سختی سے تردید کی ہے، کہ ائمہ اربعہ کے بعد اجتہاد مطلق کا اور صاحب "الکنز" علامہ نسفی کے "اجتہاد فی المذہب" کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ علامہ بحر العلوم نے اس کو بالکل بے بنیاد اور تعصب و تنگ نظری کی پیداوار قرار دیا ہے اور اس کو فتویٰ بلا علم، ضلالت اور دعویٰ غیب جیسے سخت الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔[2]

شاہ صاحب نے اپنی تصنیفات میں اس نازک مسئلہ سے تعرض فرمایا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ بڑے انصاف کی بات کہی ہے۔ شاہ صاحب کا اندازِ بیان انتہائی بصیرت اور حقیقت پسندانہ ہے، اس میں انھوں نے کسی جانب داری کے بغیر صرف واقعات اور حقائق کو اپنے پیشِ نظر رکھا ہے۔

انھوں نے اس مسئلہ کو فکری اور نظریاتی طور پر دیکھنے کے بجائے واقعاتی طور پر دیکھنے کی کوشش کی ہے اور اپنے طرزِ عمل سے یہ اشارہ دیا ہے، کہ بحث عقلی امکان یا شرعی جواز کی نہیں ہے کہ خود یہ اصطلاحات شریعت کی اساسیات میں موجود نہیں تو

---

[1] الانافع الکبیر ص ۱۴، ۱۵

[2] الانافع الکبیر ص ۱۵، ۱۶

پھر اس پر شریعت کی دلیل کیوں مانگی جائے؟ اور جو چیز تاریخ میں ایک بار وقوع پذیر ہو چکی ہو اس کے بارے میں عقلی عدمِ امکان کا سوال کیوں اٹھایا جائے؟ مگر واقعہ کیا ہے؟ اور تاریخی حقائق کیا کہتے ہیں؟ فیصلہ ان کی روشنی میں ہوگا۔

مجتہدین کا یہ سلسلہ مرضیٔ الٰہی سے شروع ہوا اور بطور ایک نعمت کے یہ اجتہاد اس امت مرحومہ کو دیا گیا۔ یہ نعمت کب تک کس معیار کی باقی رہنی چاہیے۔ اس کے لیے کوئی شرعی دلیل نہیں پیش کی جا سکتی لیکن واقعات و تاریخی حقائق کے تناظر میں یہ فیصلہ ممکن ہے کہ اللہ کی مرضی اس نعمت کے کس معیار کی کب تک رہی؟ اور کب تک نہیں رہی؟

واقعہ یہ ہے کہ شاہ صاحب نے مسئلہ کی بہت اہم نبض پکڑی ہے اور موضوع کی آخری تہ تک پہونچ گئے ہیں۔

اجتہاد منتسب واقعاتی طور پر ممکن ہے

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اجتہاد مطلق مستقل کی جہاں تک بات ہے عقلی طور پر یہ ممکن ضرور ہے، مگر بعد میں علوم و فنون میں جو پھیلاؤ پیدا ہوا اور عہدِ نبوت سے دوری کی بنا پر قرآن و حدیث کے سمجھنے کے لیے طرح طرح کے اتنے علوم وضع کیے گئے، کہ کسی ایک شخص کے لیے بیک وقت ان تمام میں مکمل مہارت حاصل کرنا ممکن نہ رہا اور جب تک تمام علوم ضروریہ میں مکمل مہارت نہ ہو اجتہاد کے اعلیٰ مقام تک انسان نہیں پہنچ سکتا۔

والنفس الانسانية وان	یعنی نفسِ انسانی خواہ کتنا ہی پاکیزہ ہو مگر اس
كانت زكية لها حدّ معلوم	کی ایک حد مقرر ہے۔ اس سے زیادہ وہ
تعجز عما وراءه، وانما	پرواز نہیں کر سکتا، یہ صرف پہلے طرز کے
كان هٰذا ميسّرًا للطراز	مجتہدین ہی کے لیے ممکن تھا، اس لیے
الاوّل من المجتهدين حين	کہ عہدِ نبوت قریب تھا اور علوم میں اس
كان العهد قريبًا والعلوم	قدر پھیلاؤ اور وسعت نہ تھی، اس کے
غير منشعبة على انه لم	باوجود متقدمین میں بھی صرف چند نفوس
يتيسّر ذالك ايضًا الا لنفوسٍ	ہی کو یہ مقام (اجتہاد مطلق مستقل) حاصل

قلیلة وهم مع ذالك كانو مقيدين بمشائخهم معتمدين عليهم ولكن لكثرة تصرفاتهم في العلم صاروا مستقلين [1]

ہوسکا اور خود وہ بھی اپنے اساتذہ ومشائخ کے طرز اجتہاد کے پابند تھے۔ مگر علم میں ان کے کثرت تصرف کی بنا پر یہ حضرات خود مستقل بالذات ہوگئے"

اس مقام پر حضرت شاہ صاحب نے امام بلقینیؒ (جو کہ مجتہد مطلق منتسب کے مقام پر فائز تھے) اور ان کے تلمیذ امام ابوزرعہؒ کا ایک دلچسپ مکالمہ درج کیا ہے:

"ابوزرعہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ اپنے شیخ امام بلقینیؒ سے کہا کہ شیخ تقی الدین السبکیؒ کے اجتہادات میں کیا کمی ہے؟ وہ تو پورے مجتہد ہیں، پھر کیوں تقلید کرتے ہیں؟ میں نے اس موقع پر خود اپنے شیخ حضرت بلقینیؒ کا ذکر پاس ولحاظ میں نہیں کیا، ورنہ میں چاہتا تھا کہ شیخ سبکی کے ساتھ خود ان کا نام بھی لے کر پوچھوں۔ میرے اس سوال پر وہ خاموش رہے، میں نے عرض کیا شاید اس کا سبب یہ ہو کہ موجودہ دور میں جتنے عہدے اور مناصب ہیں وہ مذاہب اربعہ کے مقلدین کے لیے مخصوص ہیں، اگر وہ ان کے دائرۂ تقلید سے نکل جائیں اور اجتہاد مستقل کا دعویٰ کر بیٹھیں تو ان کو کوئی عہدہ نہیں مل سکے گا اور وہ مقام قضا سے محروم کر دیے جائیں گے۔ لوگ ان سے استفتا کرنا ترک کر دیں گے اور ان پر بدعتی ہونے کا الزام آجائے گا۔ میری بات پر حضرت بلقینیؒ مسکرائے اور اس طرح گویا مجھ سے اتفاق کا اظہار فرمایا"

شاہ صاحب نے یہ مکالمہ نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ مجھے اس سے اتفاق نہیں اور میں اس بدگمانی کو مناسب نہیں سمجھتا کہ ان عظیم ہستیوں نے محض قضا اور دنیا کے عارضی عہدوں کے حصول کے لیے اپنے فرائض منصبی کے بارے میں کتمان کا معاملہ فرمایا۔ یہ ان بلند وبالا شخصیات ساتھ حق تلفی اور ناانصافی ہے اور شیخ بلقینی کا محض مسکرانا اتفاق کی دلیل نہیں ہے، اصل بات وہی ہے جس کا تذکرہ علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے اپنی کتاب "شرح التنبیہ فی باب الطلاق" میں کیا ہے کہ اس طرح کی جن شخصیات کے بارے میں آتا ہے کہ وہ اجتہاد مطلق کے مقام پر پہونچ چکے تھے۔ اس کا مطلب

---

[1] الانصاف ص ۷۲

اجتہاد مستقل نہیں بلکہ اجتہاد مطلق منتسب ہے۔ صاحب التنبیہ، بلقینی، ابن الصباغ امام الحرمین اور امام غزالی یہ تمام حضرات اجتہاد مطلق منتسب کے مقام پر فائز تھے، نہ کہ اجتہاد مستقل کے مقام پر[1]

رہا یہ کہ "اجتہاد مطلق منتسب" کے مقام پر اب کوئی فائز ہو سکتا ہے یا نہیں؟ تو علامہ نوویؒ نے "شرح المہذب" میں اس کی تصریح کی ہے کہ "یہ مقام تا قیامت باقی رہے گا۔ شرعاً اس کا انقطاع جائز نہیں، اس لیے کہ یہ فرض کفایہ ہے، اگر تمام اہل زمانہ بالکلیہ اس کو ترک کر دیں تو سب گنہ گار ہوں گے، جیسا کہ علامہ ماوردیؒ، علامہ رویانیؒ اور علامہ بغویؒ نے اس کی صراحت کی ہے[2]

شاہ صاحب نے تاریخی طور پر مذاہب اربعہ کا تجزیہ بھی کیا ہے کہ کس مذہب میں کس درجہ کے مجتہدین کس صدی تک ہوئے؟ اس تجزیے کے بعض حصوں سے اختلاف کیا جا سکتا ہے، مگر فی الواقع یہ تجزیہ بصیرت افروز ہے۔

شاہ صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

"مذہب حنفی میں تیسری صدی ہجری کے بعد اجتہاد مطلق منتسب کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس مقام پر وہی فائز ہو سکتا ہے جو اقوالِ فقہاء اور قواعدِ فقہیہ کے ساتھ حدیث میں بھی پوری مہارت رکھتا ہو اور حنفیہ ہمیشہ اس باب میں پیچھے رہے، البتہ اجتہاد فی المذہب (جس کی ادنیٰ شرط یہ ہے کہ سرخسی کی مبسوط کا حافظ ہو) کا سلسلہ جاری ہے۔

اسی طرح مذہب مالکی میں بھی مجتہد منتسب کم ہوئے اور جو لوگ اس مقام پر پہونچے ان کے تفردات مذہب کا حصہ نہ بن سکے، مثلاً ابن عبدالبرؒ اور قاضی ابوبکر بن العربیؒ۔

مذہب حنبلی کا دائرہ ہر دور میں بہت مختصر رہا، لیکن نویں صدی تک ہر طبقہ میں مجتہدین ہوتے رہے پھر اس کا زور ہی ٹوٹ گیا اور مصر و بغداد کے علاوہ دنیا کے دیگر حصوں میں اس کے ماننے والوں کی تعداد

---

[1] الانصاف ص ۷۳ [2] الانصاف ص ۷۴

بہت مختصر رہ گئی۔

علاوہ ازیں امام احمدؒ کے مذہب کی حیثیت، مذہب شافعیؒ کے بالمقابل ویسی ہی ہے جیسی کہ امام ابویوسفؒ اور امام محمدؒ کے مذہب کی مذہب ابوحنیفہؒ کے مقابلے میں فرق صرف اتنا ہے کہ امام ابویوسفؒ اور امام محمدؒ کا مذہب امام ابوحنیفہؒ کے مذہب کے ساتھ مدوّن کیا گیا جب کہ امام احمدؒ کا مذہب، مذہب شافعیؒ کے ساتھ مدوّن نہیں کیا گیا جس کی بنا پر اس کو الگ مذہب سمجھ لیا گیا، ورنہ اگر غور کیا جائے تو فی الواقع وہ کوئی جداگانہ مذہب بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

البتہ تاریخی طور پر مذہب شافعی میں مجتہد مطلق، اور مجتہد فی المذہب بکثرت ہوئے ہیں۔ اسی طرح تمام مذاہب کے مقابلے میں اصولیین، متکلمین، مفسرین قرآن، شارحین حدیث، ممتاز اور بصیرت مند فقہاء مذہب شافعی میں زیادہ پیدا ہوئے۔ مذاہب کا مطالعہ و تحقیق کرنے والے شخص کے لیے یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں ہے۔ امام شافعیؒ کے اصحاب خود بھی اجتہاد مطلق کے مقام پر فائز تھے اور بہت کم لوگ ایسے تھے جو امام شافعی کے تمام مجتہدات کی تقلید کرتے تھے۔ ابن شریحؒ تک یہی معاملہ رہا۔ ابن شریحؒ نے تقلید و تخریج کے قواعد کی بنیاد ڈالی، تو پھر مذہب شافعی نے اسی رخ پر اپنا سفر شروع کیا اور بعد کے فقہاء نے ابن شریح کے بنائے ہوئے اصولوں کو اپنے فقہی اور اجتہادی کاموں میں رہنما خطوط کے طور پر اپنے سامنے رکھا۔[1]

یقیناً شاہ صاحب نے یہ فیصلہ مذاہب اور تاریخ کے گہرے مطالعہ کے بعد فرمایا ہے۔ البتہ مذہب حنفی میں مجتہد منتسب کم ہونے کی وجہ شاہ صاحب نے جو حدیث سے تعلق میں کمی بتائی ہے، ممکن ہے بعض ناقدین کو اس سے اختلاف ہو، اس لیے کہ مذہب حنفی میں حفاظ حدیث کی کبھی کمی نہیں رہی، یہ الگ بات ہے کہ انھوں نے اس کو اپنی تصنیفات و تالیفات کا موضوع نہیں بنایا کہ یہ خدمت کرنے والے لوگ بکثرت موجود تھے۔ اس لیے

---

[1] الانصاف ص ۸۴، ۸۵

انھوں نے فنِ حدیث پر مکمل مہارت کے باوجود علم فقہ پر توجہ دی اور اس کو اپنی تحقیقات کا موضوع بنایا، ورنہ تیسری صدی کے بعد بھی (جس کے بارے میں شاہ صاحب کا خیال ہے کہ اس مذہب میں اشتغال بالحدیث کی کمی کی بنا پر اجتہاد مطلق منتسب کا سلسلہ جاری نہ رہ سکا) حنفیہ میں بڑے بڑے حفاظِ حدیث ہوتے رہے ہیں۔ مثلاً حافظ ابولبشر الدولابیؒ حافظ ابوجعفر الطحاویؒ، حافظ ابن ابی العوام السعدیؒ، حافظ ابو محمد الحارثیؒ، صاحب مسند ابی حنیفہ، حافظ عبد الباقیؒ، حافظ ابوبکر رازی الجصاصؒ، حافظ ابو نصر الکلاباذیؒ، حافظ ابو محمد السمرقندیؒ، حافظ شمس الدین السروجیؒ، حافظ قطب الدین الحلبیؒ، حافظ علاء الدین الماردینیؒ حافظ جمال الدین الزیلعیؒ، حافظ علاء الدین مغلطائیؒ، حافظ بدر الدین العینیؒ اور حافظ قاسم بن قطلوبغاؒ وغیرہ۔

اسی طرح مالکیہ میں بھی بڑے بڑے حفاظِ حدیث پیدا ہوئے، مثلاً حافظ حسین بن اسماعیل القاضیؒ، حافظ الاصیلیؒ، حافظ ابن عبد البر الاندلسیؒ، حافظ ابو الولید الباجیؒ، حافظ قاضی ابوبکر العربیؒ، حافظ عبد الحق صاحب الاحکامؒ، حافظ قاضی عیاض الیحصبیؒ، حافظ المازریؒ حافظ ابن رشدؒ الفقیہ صاحب المقدمات، اور حافظ ابو القاسم السہیلیؒ وغیرہ۔[۱]

البتہ ایک بڑی قابلِ توجہ بات علامہ مناظر احسن گیلانیؒ نے تحریر فرمائی ہے:

"حنفیوں کی فقہ کو مشرق میں اور مالکیوں کی فقہ کو مغرب میں چونکہ عموماً حکومتوں کے دستور العمل کی حیثیت سے تقریباً ہزار سال سے زیادہ مدت تک استعمال کیا گیا اس لیے قدرتاً ان دونوں مکاتبِ خیال کے علماء کی توجہ زیادہ تر جدید حوادث وجزئیات وتفریعات کے ادھیڑ بن میں مشغول رہی، بخلاف شوافع اور حنابلہ کے کہ بہ نسبت حکومت کے ان کا تعلق زیادہ تر تعلیم وتعلم درس وتدریس اور تالیف وتصنیف سے رہا۔ اس لیے عموماً تحقیق و تنقید کا وقت ان کو زیادہ ملتا رہا"[۲]

بہر حال شاہ صاحب اجتہاد (بمعنی اجتہاد منتسب یا اجتہاد فی المذہب) کو موقوف

---

[۱] مقدمہ فیض الباری شرح البخاری علامہ یوسف بنوری ص ۱۴، ۱۵ مکتبہ اشرفیہ دیوبند ۲۰۰۰ء

[۲] تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ ص ۲۳۳، اسلامک اکیڈمی لائل پور پاکستان ۱۹۶۵ء

تسلیم نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک فی الجملہ اجتہاد کی ضرورت ہر دور میں ہے اور یہ ضرورت اب اجتہادِ مطلق مستقل کی صورت سے پوری نہیں ہو سکتی اس لیے اب یا تو اجتہاد منتسب کے ذریعہ یہ ضرورت پوری ہوگی یا اجتہاد فی المذہب کے ذریعہ۔

مقدمۂ مصفیٰ میں لکھتے ہیں۔

" اجتہاد ہر زمانہ میں فرضِ کفایہ ہے۔ یہاں اجتہاد سے مراد اجتہاد مستقل نہیں جیسا کہ امام شافعی کا اجتہاد تھا، جو جرح وتعدیل، زبان دانی وغیرہ میں کسی دوسرے کے محتاج نہ تھے اور اسی طرح اپنی مجتہدانہ درایت میں (اپنے پورے اقسام کے ساتھ) وہ دوسرے کے تابع نہ تھے بلکہ مقصود اجتہاد منتسب ہے اور وہ نام ہے احکام شرعی کو ان کے تفصیلی ادلّہ کے ذریعہ جاننے کا، اور مجتہدین کے طریقے پر تفریعِ مسائل اور ترتیبِ احکام کا، خواہ وہ کسی صاحب مذہب کی رہنمائی سے ہو۔

ہم جو یہ کہتے ہیں کہ اجتہاد اس زمانے میں فرض ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مسائل کثیر الوقوع ہیں جن کا احاطہ ممکن نہیں اور ان کے بارے میں اللہ کے حکم کا جاننا واجب ہے اور جو تحریر وتدوین میں آچکا ہے وہ ناکافی ہے اور ان کے بارے میں اختلافات بہت ہیں جن کا حل کرنا دلائل کی طرف رجوع کیے بغیر ممکن نہیں، ائمہ مجتہدین سے جو مسائل کی روایات منقول ہیں ان میں اکثر میں انقطاع ہے، کہ قلب ان پر اطمینان کے ساتھ اعتماد نہیں کر سکتا، اس لیے ان کو قواعدِ اجتہاد پر پیش کیے اور تحقیق کیے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں"[1]

مسئلہ تقلید

تقلیدِ ائمہ کا مسئلہ بھی بڑا اختلافی رہا ہے اور ہر دور میں لوگ اس تعلق سے افراط و تفریط کا شکار رہے ہیں۔ ایک طرف ابنِ حزم اور ظاہر پرست حضرات ہیں، جو تقلید

---

[1] مقدمہ مصفیٰ علی المسوّیٰ ص ۲۹، ۳۰ مطبوعہ بیروت

کو بالکل حرام اور شرک کے مترادف سمجھتے ہیں، دوسری طرف غالی مقلدین کا گروہ ہے جو کتبِ فقہ کی تمام جزئیات کو وہی درجہ دیتا ہے جو قرآن وحدیث کا ہے اور اس سے ایک انچ بھی پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں ہے۔ شاہ صاحب نے ان دونوں کے درمیان نقطۂ عدل اختیار فرمایا۔ ایک طرف ابن حزم کے قول کا محل متعین کیا، دوسری طرف تقلید کا مطلب واضح کیا کہ تقلید کی حقیقت کیا ہے اور لوگ ائمہ کی تقلید کیوں کرتے ہیں؟ اسی طرح تاریخی طور پر اس پر بھی روشنی ڈالی کہ چوتھی صدی سے قبل تک لوگ تقلیدِ شخصی تو کرتے تھے مگر کسی ایک شخص یا ایک مذہب کی لازمی تعیین کے ساتھ نہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عہدِ نبوت قریب تھا۔ ہوا و ہوس کا اتنا غلبہ نہ تھا، علماء و فقہا بھی بآسانی میسّر تھے، اس لیے ہر شخص کو اس کی اجازت تھی کہ جس سے چاہے مسئلہ دریافت کرے، لیکن بعد میں ہوا و ہوس کی کثرت کی بنا پر ہر شخص قابلِ اعتماد نہیں رہا اور لوگ مسائل کے استفتاء کے لیے شخصیات کے انتخاب میں خواہشِ نفس کو دخیل بنانے لگے۔ اس ضرورت کے تحت "مذہبی تعیین" پیدا ہوئی اور لوگوں کو راہِ حق و ہدایت پر مستقیم رکھنے کے لیے متعینہ طور پر کسی ایک مذہب کی تقلید ضروری قرار دی گئی، گویا یہ امت کی دینی ضروریات کے لیے ایک انتظامی حکمت عملی تھی۔

غرض اس بارے میں شاہ صاحب نے جو مسلک اختیار کیا اور اس کی جو تعبیر کی وہ روحِ شریعت سے قریب تر، قرنِ اول کے عمل سے زیادہ ہم آہنگ، فطرتِ انسانی سے زیادہ مطابق اور عملی زندگی سے سازگار ہے۔

شاہ صاحب تقلید کی حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"سب کو معلوم ہے کہ استفتاء اور افتاء کا سلسلہ عہدِ نبوی سے لے کر برابر چلتا رہا ہے، اور ان دونوں میں کیا فرق ہے کہ ایک آدمی ہمیشہ ایک سے فتویٰ لیتا ہے، یا کبھی ایک سے لیتا ہے اور کبھی دوسرے سے، ایسی حالت میں کہ اس کا ذہن صاف ہے۔ اس کی نیت سلیم ہے اور وہ صرف اتباعِ شریعت چاہتا ہے۔ یہ بات کیسے جائز نہیں؟ جب کہ کسی فقیہ کے بارے میں ہمارا یہ ایمان نہیں ہے کہ اللہ نے اس پر آسمان سے فقہ اتاری اور ہم پر اس کی اطاعت فرض کی ہے اور یہ کہ وہ معصوم ہے تو اگر ہم

نے ان فقہا، وائمہ میں سے کسی کی اقتدا کی تو محض اس بنا پر کہ ہم یہ جانتے ہیں کہ وہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کا عالم ہے۔ اس کا قول (فتویٰ) دو حالتوں میں سے کسی ایک حالت سے خالی نہیں، یا وہ کتاب وسنت کے صریح حکم پر مبنی ہے، یا وہ استنباط کے اصولوں میں سے کسی اصول کے مطابق اس سے مستنبط کیا ہوا ہے، یا اس نے قرائن سے یہ سمجھ لیا ہے کہ حکم فلاں علت کے ساتھ وابستہ ہے (اور وہ علت یہاں پائی جاتی ہے) اور اس کا قلب اس بات پر مطمئن ہوگیا ہے، اس بنا پر اس نے غیر منصوص کو منصوص پر قیاس کیا، گویا وہ زبانِ حال سے کہتا ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ جہاں یہ علت پائی جائے وہاں حکم یہ ہوگا، اور یہ قیاسی مسئلہ اس عموم اور کلیہ میں شامل ہے۔ اس طرح اس حکم کی نسبت بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کی جاسکتی ہے۔ لیکن ظنی طریقہ پر اگر صورت حال یہ نہ ہوتی تو کوئی صاحب ایمان کسی مجتہد کی تقلید نہ کرتا، اگر ہمیں رسولِ معصوم صلی اللہ علیہ وسلم جن کی اطاعت کو اللہ تعالیٰ نے ہم پر فرض کیا ہے کی کوئی حدیث قابلِ وثوق سند سے پہونچے جو اس مجتہد یا امام کے فتویٰ اور قول کے خلاف ہو اور ہم اس حدیث کو چھوڑ دیں، اور اس ظنی طریقہ کی پیروی کریں تو ہم سے بڑھ کر ناروا طریقہ اختیار کرنے والا کون ہوگا اور کل ہمارا خدا کے سامنے کیا عذر ہوگا؟[1]

علامہ ابن حزم جو تقلید کے خلاف ہیں، ان کے قول کا محمل متعین کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

"ابن حزم کے قول کا مصداق وہ شخص نہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کے علاوہ کسی کو اپنے لیے واجب الاطاعت نہیں سمجھتا، وہ حلال اسی کو گردانتا ہے جس کو اللہ اور اس کے رسول نے حلال کیا اور حرام اسی کو مانتا ہے جس کو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیا، لیکن چونکہ اس کو براہِ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم (کے اقوال واحوال) کا علم حاصل نہیں اور وہ آپ کے

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۵۶

مختلف اقوال میں تطبیق دینے کی صلاحیت اور آپ کے کلام سے مسائل استنباط کرنے کی قدرت نہیں رکھتا وہ کسی خدا ترس عالم دین کا دامن پکڑ لیتا ہے۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ وہ صحیح بات کہتا ہے اور اگر مسئلہ بیان کرتا ہے تو اس میں وہ محض سنتِ نبوی کا پیرو اور ترجمان ہوتا ہے، جیسے ہی اس کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا یہ خیال صحیح نہیں تھا اسی وقت وہ بغیر کسی بحث و اصرار کے اس کا دامن چھوڑ دیتا ہے۔ بھلا ایسے آدمی کو کوئی کیسے مطعون کرے گا اور اس کو سنت و شریعت کا مخالف قرار دے گا۔"[1]

"اس قول کا مصداق وہ عامی مقلد ہے جو اپنے امام کے بارے میں یہ تصور رکھے کہ اس سے غلطی کا کوئی امکان نہیں ہے اور اس کی ہر بات قطعی طور پر درست ہے، نیز اس کا عزم ہو کہ وہ اس کی تقلید کبھی ترک نہیں کرے گا چاہے اس کے خلاف کتنی ہی دلیلیں آجائیں۔

اسی طرح اس میں وہ شخص بھی آتا ہے جو اس بات کو جائز نہیں سمجھتا کہ ایک حنفی کسی شافعی فقیہ یا شافعی کسی حنفی فقیہ سے فتویٰ پوچھے یا اس کے پیچھے نماز پڑھے، اس لیے کہ یہ اجماعِ سلف اور صحابہ و تابعین کرام کے عمل کے خلاف ہے۔

یہ ہے ابن حزم کے قول کا منشا، ان قیود و شرائط کو ملحوظ رکھ کر اس کا اطلاق کیا جائے گا اور جہاں صورتِ حال یہ نہ ہو وہاں تک اس کا دائرہ وسیع نہیں ہو سکتا۔"[2]

مذاہبِ اربعہ کی تخصیص

البتہ چوتھی صدی ہجری سے قبل تک مذاہبِ اربعہ کے علاوہ دوسرے مجتہدین کی بھی تقلید کی جاتی تھی لیکن دوسرے حضرات مجتہدین کے مذاہب گردشِ ایام کے اثر سے پوری طرح محفوظ نہ رہ سکے اور نہ ان کے پیروکاروں کی تعداد باقی رہی، اب

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۵۵ [2] الانصاف ص ۱۰۰-۱۰۱

ان کے ہی اقوال وآرا محفوظ رہ گئے ہیں جو مذاہبِ اربعہ کی کتابوں میں مختلف مناسبتوں سے مذکور ہوئے ہیں۔ اس لیے چوتھی صدی ہجری کے بعد ان مذاہبِ اربعہ کے سوا کوئی مذہب باقی نہ رہا اس لیے حکمتِ الٰہی سے قدرتی طور پر تقلیدِ شخصی انہی چار مذاہب میں منحصر ہو کر رہ گئی، حضرت شاہ صاحب نے اپنی کتاب "عقد الجید فی احکام الاجتہاد و التقلید" میں اس پر بہت محققانہ اور تفصیلی گفتگو کی ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

"یاد رکھو کہ ان مذاہبِ اربعہ کے اختیار میں بڑی مصلحت ہے اور ان چاروں کو بالکل نظرانداز کر دینے میں بڑا مفسدہ ہے، اس کے کئی وجوہ واسباب ہیں۔ ایک یہ کہ امت کا اس پر اتفاق رہا ہے کہ شریعت کے معلوم کرنے کے بارے میں سلفِ متقدمین پر اعتماد کیا جائے۔ تابعین نے اس بارے میں صحابہ پر اعتماد کیا اور تبع تابعین نے تابعین پر، علیٰ ہذا القیاس ہر دور کے علماء نے اپنے پیش رؤں پر اعتماد کیا، عقل سے بھی اس کا مستحسن ہونا ثابت ہوتا ہے، اس لیے کہ شریعت کے علم کا ذریعہ نقل اور استنباط ہے اور نقل اسی وقت ممکن ہے جب ہر طبقہ اپنے اس پہلے طبقہ سے جو اس سے متصل ہے، اخذ کرے، استنباط میں بھی یہ ضروری ہے کہ متقدمین کے مذاہب معلوم ہوں، تاکہ ان کے اقوال کے دائرہ سے خارج ہو کر خرقِ اجماع نہ ہو جائے۔ اس کے ان اقوال کے جاننے اور سابقین سے مدد لینے کی ضرورت، دوسرے علوم وفنون اور ہنروں اور پیشوں میں بھی پائی جاتی ہے، صرف، نحو، طب، شاعری، لوہاری، نجاری، رنگ ریزی سب اسی وقت حاصل ہوتے ہیں جب ان کے استادوں اور ان کے ساتھ اشکال رکھنے والوں کی صحبت اختیار کی جائے، اس کے بغیر مہارت حاصل ہو جائے ایسا بہت کم ہوتا ہے، اگرچہ عقلاً ایسا ممکن ہے لیکن واقعۃً ہوتا نہیں۔

جب یہ بات متعین ہو گئی کہ سلف کے اقوال وتحقیقات پر اعتماد ضروری ہے تو پھر یہ ضروری ہو گیا کہ جن اقوال پر اعتماد کیا جا رہا ہے، وہ سندِ صحیح سے مروی اور مشہور کتابوں میں مدوّن ہوں، اور ان پر ایسا کام ہوا ہو کہ اس میں راجح اور مرجوح اور عام وخاص کا امتیاز آسان ہو، جہاں اطلاق پایا جاتا ہے

وہاں یہ پتہ چل سکے کہ اس میں مقید کیا ہے؟ مختلف اقوال میں تطبیق دی جا چکی ہو اور احکام کے علل پر روشنی ڈالی گئی ہو، نہیں تو ایسے مذاہب و اجتہادات پر اعتماد صحیح نہیں ہوگا، ان پچھلے ادوار میں کوئی مذہب (فقہی) بھی ایسا نہیں ہے جس میں یہ صفات پائی جاتی ہوں اور یہ شرطیں پوری ہوتی ہوں، سوائے ان مذاہب اربعہ کے۔

جب ان مذاہبِ اربعہ کے علاوہ دیگر تمام مذاہب حقہ مٹ گئے، تو اپنی مذاہبِ اربعہ کی اتباع سوادِ اعظم کی اتباع مانی جائے گی اور ان کی اتباع سے خروج سوادِ اعظم سے خروج مانا جائے گا۔[۱]

ان مذاہب کی اتباع بھی علی العموم نہیں بلکہ کسی ایک مذہبِ معین کی اتباع لازم ہے دوسری صدی سے قبل تک اس میں توسّع تھا، مگر اس کے بعد یہ توسّع ختم کر دیا گیا۔ اس لیے کہ اب نہ وہ ورع و احتیاط رہی، اور نہ وہ خوفِ خدا اور جذبۂ تحقیق حق باقی رہا۔ اگر آج اس بات کی کھلی آزادی دے دی جائے کہ جس مجتہد کا چاہو قول اختیار کر لو تو دین ایک کھلونا بن کر رہ جائے گا، کیونکہ اکثر مجتہدین کے یہاں کچھ نہ کچھ منفرد اقوال ایسے ملتے ہیں جن کو خواہشاتِ نفس کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

شاہ صاحب نے انہی حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے بڑی تاکید کے ساتھ کہا ہے کہ

وبعد المائتين ظهر فيهم	دوسری صدی ہجری کے بعد متعینہ طور پر
التمذهب للمجتهدين بأعيانهم	کسی مجتہد کے مذہب کو اختیار کرنے کا رجحان
وقلّ من كان لا يعتمد على مذهب	پیدا ہوا اور بہت کم لوگ ایسے رہے جو کسی
مجتهد بعينه وكان هذا هو الواجب في	معیّن مذہب کے پابند نہ ہوں اور اس زمانے
ذلك الزمان[۲]	میں یہی واجب تھا۔

---

[۱] ولما اندرست المذاهب الحقة الا هذه الاربعة كان اتباعها اتباعًا للسواد الاعظم والخروج عنها خروجًا عن السواد الاعظم (عقد الجید ص ۳۷-۳۸)

[۲] الانصاف ص ۷۰

تقلید واجب لغیرہ ہے

البتہ اس پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ جو چیز عہدِ نبوت میں واجب نہ تھی وہ بعد میں کیسے واجب ہوگئی؟ اس کا جواب دیتے ہوئے حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ واجب کی دو قسمیں ہیں، ایک واجب لعینہ، دوسرے واجب لغیرہ، واجب لعینہ تو وہی چیزیں ہیں جن کو عہدِ رسالت میں واجب کر دیا گیا۔ اس کے بعد ان میں اضافہ نہیں ہو سکتا، لیکن واجب لغیرہ میں اضافہ ہو سکتا ہے، وہ اس طرح کہ مقصد تو ایک واجب کی ادائیگی ہوتی ہے۔ لیکن اگر اس واجب کی ادائیگی کا کسی زمانہ میں صرف ایک طریقہ رہ جائے تو وہ طریقہ واجب ہو جاتا ہے۔ مثلاً عہدِ رسالت میں احادیث کی حفاظت واجب تھی لیکن کتابت واجب نہ تھی، کیونکہ حفاظتِ حدیث کا فریضہ محض حافظہ سے بھی ادا ہو سکتا تھا۔ لیکن بعد میں جب حافظوں پر اعتماد نہ رہا، تو حفاظتِ حدیث کا کوئی طریقہ بجز کتابت کے باقی نہ رہا، اس لیے کتابت واجب ہوگئی، اسی طرح عہدِ صحابہ و تابعین میں غیر مجتہد کے لیے مطلق تقلید واجب تھی، لیکن جب تقلیدِ مطلق کا راستہ پُرخطر ہوگیا تو اب صرف تقلیدِ شخصی ہی کو واجب قرار دیا گیا[1]

اس کلیہ کے مطابق اگر کہیں مذہبِ حنفی کے سوا کسی دوسرے مذہب کے علماء و فقہاء نہ ہوں تو مذہبِ حنفی ہی کی تقلید لازم ہے۔ اس سے خروج جائز نہیں، اس لیے کہ مذہبِ حنفی سے خروج اسلام سے خروج کا سبب بن جائے گا[2]

غرض بحالاتِ موجودہ عامی شخص کے لیے شریعت پر عمل کرنے کی واحد صورت یہ ہے کہ وہ ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک امام کی تقلید کرے حضرت شاہ صاحب نے اس

---

[1] الانصاف ص ۷۷، ۷۸

[2] وعلیٰ ھٰذا ینبغی ان القیاس وجوب التقلید لامام بعینہٖ فانہ قد یکون واجبًا وقد لا یکون واجبًا فاذا کان انسان جاھل فی بلاد الھند او فی بلاد ما وراء النہر ولیس ھناک عالم شافعی ولا مالکی ولا حنبلی ولا کتاب من کتب ھٰذہ المذاھب وجب علیہ ان یقلد لمذھب ابی حنیفۃ ویحرم علیہ ان یخرج من مذھبہ لانہ حینئذٍ یخلع ویبقیٰ سُدًی مہملًا (الانصاف ص ۷۹)

پر امت کا اجماع نقل کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

ان هٰذه المذاهب الاربعة	مذاہب اربعہ جو تحریری صورت میں موجود
المدوّنة المحرّرة قد اجتمعت الامة	ہیں، پوری امت یا کم از کم امت کے قابل لحاظ
ای من یعتدّ منها علی جواز تقلیدها الی یومنا	طبقہ نے آج تک ان کی تقلید کے جواز پر اتفاق
هٰذا وفی ذالك من المصالح مالا یخفی	کیا ہے۔ ان میں جو مصالح و اسرار ہیں بالخصوص
لاسیما فی هٰذه الایام التی قصرت فیها	موجودہ حالات میں جبکہ ہمتیں کوتاہ ہیں، ہوا پرستی
الهمم جدّا واشربت النفوس الهوٰی و	کا دور دورہ ہے اور ہر شخص اپنی رائے پر نازاں
اُعجب کل ذی رائی برائه [1]	ہے، وہ مخفی نہیں ہے۔

اس طرح شاہ صاحب نے تقلید کے تمام گوشوں پر محققانہ کلام کیا ہے اور اس پر وارد ہونے والے تمام اشکالات کا بھی ازالہ کر دیا ہے۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ شاہ صاحب غیر مقلد تھے۔ حیرت ہے تقلید کی اتنی مدلل و محقق وکالت کرنے والا شخص غیر مقلد کیوں قرار پا سکتا ہے؟ صحیح ہے کہ شاہ صاحب نے بعض چیزوں میں مذہب حنفی سے اختلاف کیا ہے، لیکن جب امام بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی اور عباس الاصم اپنے مذہب سے بعض اختلافات کے باوجود شاہ صاحب کے نزدیک دائرۂ تقلید سے خارج نہیں ہیں، بلکہ ابن جریر طبری اپنے شدید اختلافات کے باوجود مذہب شافعی سے خارج نہیں ہیں[1]۔ تو پھر شاہ صاحب اپنے بعض اختلافات کی بنا پر مذہب حنفی سے خارج کیسے قرار پا سکتے ہیں؟

پھر اگر شاہ صاحب کے نزدیک تقلید اور بالخصوص ائمہ اربعہ کی تخصیص اتنی ہی غیر ضروری چیز ہوتی تو "الانصاف" میں مستقل یہ باب قائم نہ فرماتے:

باب تاکید الاخذ بهٰذه المذاهب	یعنی مذاہب اربعہ کی تقلید ضروری ہے اور
الاربعة والتشدید فی ترکها والخروج عنها	ان سے خروج سخت گناہ ہے۔

اس باب کے تحت شاہ صاحب نے مختلف وجوہ سے ثابت کیا ہے کہ ان مذاہب اربعہ کی تقلید کیوں ضروری ہے؟ اربابِ نظر کو اس کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔ (باقی)

---

[1] بعض علماء نے طبری کو شافعیہ سے خارج قرار دیا ہے مگر شاہ صاحب کو اس سے اختلاف ہے، ان کے نزدیک طبری کا شمار شافعیہ ہی میں ہونا چاہیے۔ الانصاف ص ۷۶